خواجہ بدر

کلیسیائی علم الکلام کی تشکیل

عیسائی علم کلام کی تدوین یوں ہوئی کہ عیسائی متکلمین نے یہ کوشش کی کہ انجیلوں میں پیش کردہ نظریہ حیات کو فلسفیانہ اصطلاحات میں ایک منظم اور باقاعدہ طریقے سے بیان کریں۔ یہ مذہبی صحیفے درحقیقت ایک طریقہ زندگی یا دین کی راہنمائی کے لیے تیار کیے گئے تھے' لیکن اس کوشش کے نتیجے میں وہ ایک فلسفیانہ نظریے کے بھی حامل قرار پائے۔ کئی متضاد تاویلات سامنے آئیں جن سے مذہبی مباحث اور مناظروں کا دروازہ کھل گیا' لیکن وہ عقیدہ جو عام طور پر عیسائیوں میں آرتھوڈوکس سمجھا جاتا ہے' صاف ہو کر آہستہ آہستہ واضح شکل میں سامنے آگیا اور فلسفیوں کے تصورات کی مدد سے اس میں ایک منطقی ربط اور مطابقت پیدا کی گئی۔

ان تمام عقائد کو ایک منظم شکل دینے کی کوشش میں جو مشکلات پیش آئیں اور جو چند نتائج اس سے برآمد ہوئے ان کا مختصر ذکر کرنا مناسب ہے۔ اس مقصد کے لیے ہم ان مختلف اور کسی حد تک متضاد عناصر پر بحث کریں گے جن میں فلسفیانہ نظریات کی مدد سے ایک ہم آہنگی اور مطابقت پیدا کرنے سے عیسائی نظریہ خدا کی تشکیل ہوئی۔ اس کوشش سے فلاسفہ کے نظریات کا ایک واضح خلاصہ بھی سامنے آجائے گا۔

عیسائی متکلمین نے خدا کے متعلق اپنا نظریہ پیش کرتے ہوئے دو بظاہر مختلف تصورات میں وحدت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ایک طرف تو خدا کا شخصی تصور تھا۔ یہ تصور ایسے خدا کا تھا جس کے ساتھ انسان دوسرے اشخاص کی طرح تعلقات قائم کرسکتا ہے۔ دوسری طرف خدا کا تصور ایک خالص مابعد الطبیعی اصول یا جوہر کا سا تھا جس کی مدد سے ہم اس کائنات کی تمام اشیاء کی فلسفیانہ تشریح کر سکتے ہیں اور کثرت سے وحدت تک پہنچ سکتے ہیں۔

خدا کا پہلا تصور تو انسان کی اس عالمگیر ضرورت کو پورا کرتا ہے جو ہر زمانے اور ہر ملک میں اسے شدت سے محسوس ہوتی رہی۔ جب انسان اپنی دنیاوی زندگی میں مشکلات اور پریشانیوں سے دوچار ہوتا ہے تو اسے ایک ایسے خدا کی ضرورت ہوتی ہے جس سے وہ براہ راست تعلق پیدا کرسکے' اس کے آگے اپنی تکلیفوں کو بیان کرسکے اور جس سے وہ پوری توقع رکھتا ہے کہ وہ اس کی مدد اور راہنمائی کرے گا۔ دوسرا تصور انسان کی اس ذہنی ضرورت کو پورا کرتا ہے جس کے

باعث ہر فلسفی نے کوشش کی کہ اس کثرت کو کسی وحدت میں تبدیل کرے اور اس طرح اس کی مدد سے اس کثرت کی منطقی تشریح کرسکے۔ اس وحدانی نظریے کی مدد سے چند ان اشخاص کے خالص مذہبی تقاضے بھی پورے ہوتے تھے جن کا رجحان متصوفانہ تھا۔ ان کے نزدیک انسانوں کا ایک علیحدہ اور انفرادی وجود اس اصل مطلقہ کی وحدت کے تقاضوں کے خلاف ہے اور اس لیے ایسے لوگوں کے خیال میں صحیح لائحہ عمل یہی ہے کہ اس کثرت کے پردے کو ہٹا کر وحدت میں مدغم ہوجانا چاہیے اور یہی نجات کا صحیح ترین طریقہ ہے۔ عیسائی علم کلام نے ان دونوں ضرورتوں کی اہمیت کو محسوس کیا اور اس لیے ان دونوں تصورات میں تطابق پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اس کے نزدیک یہ دونوں تصورات مساوی طور پر اہم تھے اور اس لیے ان میں سے کسی کو برتر مقام دینا اور دوسرے کو کمتر قرار دینا غلط سمجھا گیا اور پوری پوری کوشش کی گئی کہ ان میں ہم آہنگی پیدا کی جائے۔

لیکن چونکہ یہ دونوں تصورات کافی پیچیدہ تھے اور ان کے مضمرات کا تقاضا ایک دوسرے سے مختلف تھا' اس لیے جوں جوں ان میں تطابق پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی رہی' ان کا بنیادی تضاد اور ثنویت نمایاں ہوتی رہی۔ خدا کے شخصی تصور نے دو مختلف شکلیں اختیار کیں جو دو متضاد نصب العینوں کی مظہر تھیں۔ ایک کا سرچشمہ اسرائیلی مذہب تھا۔ اس کے مطابق خدا ایک حاکم مطلق اور قانون ساز تھا۔ انسانوں کا فرض تھا کہ وہ اس کے قانون کی مکمل پیروی کریں کیونکہ وہ اس کی رعایا اور مخلوق ہیں۔ دوسرے کا سرچشمہ ہیلینی دور کے باطنی مذہبی اسرار تھے۔ کچھ تو رواقی فلسفے کے تصورات اور کچھ مسیح کے مصلوب ہونے سے یہ نقطۂ نگاہ زیادہ توجہ کا مستحق قرار پایا۔ اس کے مطابق خدا انسانوں کے گناہ اور ان کی موت کا کفارہ ادا کرتا ہے۔ وہ انسانوں پر اتنا شفیق اور مہربان ہے کہ اس نے ان کی مشکلات اور مصائب کو دور کرنے کے لیے ایک انسانی شکل اختیار کی اور پھر انتہائی مصائب برداشت کرتے ہوئے مصلوب ہوا۔ عیسائیت ان دونوں تصورات کو ترک نہ کرسکی' اگرچہ ان میں تطابق پیدا کرنا ایک ناممکن امر تھا۔ یہ مشکل دو قسم کی ہے۔ ایک طرف تو حاکم مطلق خدا قائم بالذات ہے۔ مخلوق کی ذات اس کی ذات پر منحصر ہے' لیکن اپنے کمال کے لیے وہ ان کا محتاج نہیں۔ ان کا وجود و عدم اس کے کمال ذات پر کسی طرح اثر انداز نہیں ہوتا' لیکن دوسرے تصور کے خدا کی خصوصیت ہی انسانوں کی خاطر قربان ہونا ہے' اس لیے اس کے مطابق انسانوں کا وجود ناگزیز ہے جن پر وہ اپنی محبت اور شفقت کا اظہار کرسکے۔ چنانچہ اس تصور کی رو سے خدا قائم بالذات نہیں۔ دوسری طرف اس قسم کا تصور

پہلے قسم کے خدا کی ہستی کے خلاف ہے۔ وہ حاکم مطلق اور قانون ساز ہے اور اس لیے لوگوں سے اس قانون اور شریعت کی پیروی کا مطالبہ کرتا ہے۔ عوام سے اس شریعت کی پیروی میں غلطیاں اور کوتاہیاں سرزد ہوتی ہیں اور اگر دوسری قسم کا خدا موجود نہ ہوتا تو مکمل تباہی و نامرادی ان کا انجام ہوتا۔ اس طرح گویا پہلا حاکم خدا انسانوں کو ان کے گناہوں کی سزا دیتا ہے' لیکن دوسرا خدا ان کو گناہوں کے وبال سے بچاتا ہے' تاہم یہ دونوں خدا مماثل اور ایک دوسرے کے عین ہیں' یا کم از کم ان میں سے کوئی ایک بھی دوسرے کے خلاف عمل پیرا نہیں۔

خدا کا مابعدالطبیعی تصور دو مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتا ہے اور یہ دونوں شکلیں افلاطونی اور نوافلاطونی فلسفوں میں نمایاں طور پر موجود ہیں۔ ارسطو کے ہاں ان دونوں میں تطابق پیدا کرنے کی کوشش نظر آتی ہے۔ ایک تو خدا کا وہ تصور ہے جس کے مطابق وہ جوہر کلی ہے۔ یہ تصور متصوفانہ رجحان کی تسکین کرتا ہے جو ایک ایسی وحدت کا متقاضی ہے جو ہر قسم کی کثرت سے بالا اور ماوراء ہے۔ اسی تصور سے وہ اصول مطلقہ حاصل ہوتا ہے جس کے باعث اس کائنات کا ظہور ہوتا ہے اور جس میں وہ دوبارہ مدغم ہو جاتی ہے۔ اس تصور کا ابتدائی سرچشمہ غالبا" ہندو فکر ہے۔ دوسرا خدا کا وہ تصور ہے جس کے مطابق وہ دنیا کے مختلف واقعات اور حادثات کی علت اولیٰ ہے۔ جو ان اشیاء اور مخلوقات کی فطرت کا تعین کرتا ہے جس کے باعث ان سے ایک خاص طرح کے اعمال سرزد ہوتے ہیں۔ یہ نظریہ انسان کی علمی اور سائنسی تحقیقات کی بنیاد ہے۔ یہ تصور افلاطون اور اسرائیلی انبیاء دونوں کے فکر میں یکساں طور پر پایا جاتا ہے۔ اس کے مطابق یہ دنیا خدا کی تخلیق ہے اور انسانی تاریخ کا نشو و نما اس کے بنیادی مقصد کا مظہر ہے۔ افلاطون نے اپنے مکالمہ ٹیمیس میں اس دنیا کی سائنسی تشریح کی ایک مفصل اسکیم پیش کی ہے اور مغربی سائنس اسی سرچشمے سے پیدا ہوئی۔ پہلے تصور کے مطابق جب انسان اس دنیا کی انفرادی اشیاء اور واقعات اور ہمہ گیر کثرت سے گھبرا کر جس وحدت کی تلاش میں سرگرداں چل نکلتا ہے' اس کی آخری منزل یہی خدا ہے جس کی ذات میں یہ تمام کثرت گم ہو جاتی ہے۔ دوسرے تصور کے مطابق وہ تمام مراتب کونیہ کا نصب العین یعنی اصل ہے جو اس ذات واحد سے لے کر آخری مرتبہ تک چلا گیا ہے۔ عیسائی علم کلام ان دونوں تصورات سے بے نیاز نہ ہو سکتا تھا اور اس کے باوجود ان دونوں تصورات میں تطابق پیدا کرنا ایک امر محال معلوم ہوتا تھا۔ اگر پہلے اصول کو کلیتا" اور پورے منطقی مضمرات کے ساتھ قبول کر لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم ان جزئیات کی کثرت سے منکر ہو جائیں جن کی بنا پر ہم نے وحدت کی تلاش شروع کی تھی۔ سوائے

اس محیط جوہر کل کے اور کوئی موجود نہیں' لیکن اگر یہ معاملہ صحیح ہے تو پھر کثرت سے وحدت کی طرف تلاش کا کیا مقصد ہے؟ دوسرا اصول جزئیات کو حقیقی سمجھنا ہے اور اس حالت میں اس واقعہ کی تشریح ایک مشکل امر ہے کہ اگر ذات واحد خیر کل ہے تو اس سے ناقص اور کم حقیقی جزئیات کیسے صادر ہو گئیں۔ خیر سے شر اور وحدت سے کثرت کیوں اور کیسے ظہور میں آئے؟ موجودہ دور میں دینیات نے اس مسئلہ کو نظر انداز کر دیا ہے اور اس کے حل کو سائنس کے سپرد کرنے کا فیصلہ کیا ہے جو علت اولیٰ کے تصور کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں۔

انہی مشکلات اور تضادات کو حل کرنے کی ایک کوشش نظریہ تثلیث ہے۔ ایک طرف خدا حاکم و قانون ساز ہے جس کی قوت تخلیق نے اس دنیا کی جزئیات پیدا کیں۔ دوسری طرف وہ فلاسفہ کا جوہر کل بھی ہے جو متصوفین کا نصب العین بھی ہے۔ یہ خدا تثلیث میں بمنزلہ باپ کے ہے۔ وہ خدا جو مخلوق کی محبت میں سرشار اور اس کا نجات دہندہ ہے وہ لوگوس (کلمہ) یا واسطہ ہے جس کی ضرورت اس لیے محسوس ہوئی تاکہ بالکل نچلے درجے کی موجودات کی تخلیق کا جواز پیش کیا جاسکے۔ یہ خدا تثلیث میں بمنزلہ بیٹے کے ہے جو خدا سے علیحدہ ہوتے ہوئے بھی اسی طرح ازلی اور ابدی ہے۔ روح القدس جو باپ اور بیٹے دونوں سے صادر ہوئی ہے' ہر عیسائی کی زندگی میں مسیح کی مسلسل موجودگی کی علامت اور کلیسیا کے تاریخی ارتقا میں خدا کی رحمت اور مقصدیت کا اظہار ہے۔ اکثر متکلمین اس تثلیث میں روح القدس کے وجود کو ضروری اور ناگزیر نہیں سمجھتے تھے' لیکن چونکہ شروع ہی میں اس کو خدائی تصور میں شامل کر لیا گیا تھا' اس لیے اس کا وجود لازمی قرار پایا۔ یہ واقعہ قابل غور ہے کہ اس ثلیثی نظریے کے تحت خدا کا وجود شخصی نہ رہا' بلکہ خالص ماورائی بن گیا۔ تثلیث کا ہر عنصر اپنی ذات میں شخصی صفات کا حامل ہے' لیکن وہ ذات جس میں تینوں عناصر مجتمع ہوتے ہیں وہ شخصی صفات کا حامل نہیں کہلا سکتا۔ آگسٹائن کے نظام میں انہوں نے جو صورت اختیار کی اس کا ابھی ذکر ہوگا' لیکن اس کے ہاں ایک خصوصیت یہ پائی جاتی ہے کہ اس نے تثلیث میں دوسرے عنصر (یعنی خدا بہ حیثیت لوگوس یا بیٹا) کو باقی دونوں عناصر پر زیادہ فوقیت دی۔ اگرچہ یہ نقطۂ نگاہ کلیسیا کے مروجہ عقیدہ کے مطابق نہیں تھا۔

اس دور میں جب عیسائیت کے عقاید تشکیل پارہے تھے' ان کی تشریح و تاویل کے طریقے اور ان کے حق میں دلائل کی ماہیت بھی متشکل ہوتی رہی۔ اس سلسلے میں سب سے اہم شخصیت اسکندریہ کے متکلم اوریجن (Origen) کی تھی جس نے ۲۵۰ عیسوی کے قریب عیسوی علم کلام پر

پہلی باقاعدہ کتاب لکھی۔ اوریجن کے ہاں اسرائیلی اور نوافلاطونی عقیدہ پایا جاتا ہے جس کے مطابق خدا تمام حقیقت کا سرچشمہ ہے اور اس نے سائنس کا مروجہ یونانی تصور قبول کر لیا۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ موخر الذکر کے مطابق سائنس کا مقصد ان تفصیلی حقائق کی استخراجی تشریح ہے جو اصول اولیہ سے صادر ہوتے ہیں۔ اور یہ اصول اولیہ مادی حقائق سے مقدم ہیں اور انہی اصولوں کی مدد سے ان حقائق کی توجیہ اور تشریح ہوسکتی ہے۔ اوریجن نے انہی تصورات اور نظریات کی روشنی میں مسائل کی تاویل اور تشریح پیش کرنے کی کوشش کی اور یہ اسلوب بارہویں صدی عیسوی تک مروج رہا' اور بعض بنیادی معاملات میں اس کی پیروی شلائر ماشر کے زمانے یعنی انیسویں صدی کے آغاز تک ہوتی رہی۔ اوریجن کے علم کلام کی ابتدا اس کے نظریہ خدا اور اس کی اساسی صفات سے ہوتی ہے۔ خدا کی تعریف اس کے نزدیک "نفس"(Spirit) ہے۔ اس تصور کے تجربے سے وہ اس کی صفات تک پہنچتا ہے۔ وہ سادہ (یعنی اجزا سے مرکب نہ ہونا)' حاضر و ناظر' حکیم ہے جس کو انسان کا محدود ذہن تصور میں نہیں لاسکتا۔ اس کے بعد اور اسی کی بنیاد پر اوریجن نے مسیح' روح القدس' فرشتوں' شیطان' مادی دنیا' انسان اور طریقہ نجات پر بحث کی ہے۔ ہر مسئلہ میں اس کے مفروضات یا تو بائبل پر مبنی ہیں یا رسولوں کی روایات پر۔ اور اس کے بعد اس نے اپنے مروجہ زمانے کے علوم کی روشنی میں ان مسائل کی تفصیلات اور ان کے مضمرات پر بحث کی ہے۔ اکثر اس نے اپنے نتائج کی تائید میں بائبل کے حوالے دیے ہیں' لیکن اس جگہ ایک بات خاص طور قابل غور ہے۔ جتنے حوالے اس کے ہاں ملتے ہیں تقریباً ہر جگہ اس نے بائبل کے لغوی مفہوم کی جگہ اس کی تاویل کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس ساری کتاب میں جو بھی دلائل استعمال کیے گئے' وہ عقلی اور استدلالی ہیں اور اس میں اس نے وہ تمام مابعد الطبیعیاتی اور اخلاقی تصورات استعمال کیے ہیں جو قدیم فلاسفہ کے ہاں تفصیل سے زیر بحث آچکے تھے۔ اگرچہ اس زمانے میں تجربی (EMPIRICAL) طریقہ استدلال مروج ہوچکا تھا جیسا کہ مثلاً طب میں' لیکن اوریجن نے اس تجربی طریقہ استدلال کے مقابلہ پر تحلیلی اور استخراجی طریقہ استدلال کو جس میں عقل و نقل دونوں کی آمیزش تھی ترجیح دی۔ یہ ترجیح مغربی علم کلام کی بعد کی تاریخ کے لیے بہت اہم ثابت ہوئی۔ اگر اوریجن اور اس کے جانشین دوسرا طریقہ استدلال اختیار کر لیتے تو سائنس اور علم کلام کی جدید کش مکش شاید ایک ثانوی حیثیت اختیار کر لیتی۔

اس دور میں جو اہم معاشرتی تبدیلیاں ظاہر ہوئیں ان میں ایک روم کے مرکزی اقتدار کے

تحت مغربی کلیسیا کا ایک منظم نظام کی شکل میں قائم ہوتا تھا۔ قدیم عیسائیوں کی اکثریت کا یہ عقیدہ تھا کہ نجات کے لیے بپتسمہ کے ذریعہ کلیسیا کی برادری میں شامل ہونا ناگزیر تھا (یوحنا ۳: ۵' ۶: ۵۳)' لیکن کلیسیائی نظام کی حاکمیت مطلقہ کا مسئلہ ابھی پیش نہیں آیا تھا۔ تاہم رومی ذہن کے لیے ایک مرکزی نظام حاکیت کا قیام ایک فطری تقاضا تھا اور تاریخی واقعات نے بھی اس رجحان کی تائید کی۔ مختلف مجالس شوریٰ نے آرتھوڈوکس عقیدے کا تعین کردیا تھا' لیکن اس کے باوجود اختلافات ابھرتے رہے اور فرقے بنتے رہے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ رومی سلطنت کا زوال شروع ہوگیا۔ ان حالات میں سماجی یک جہتی اور معاشرتی نظام کی بحالی کے لیے ایک مرکزی نظام حاکمیت کا احساس ترقی پذیر ہوتا رہا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغربی یورپ میں رومن کیتھولک کلیسیا بطور حاکمیت اعلیٰ قائم ہوگیا۔ اس کے ساتھ یہ عقیدہ بھی پیدا ہوا کہ نجات کا کلی دارو مدار کلیسیا کی رسوم اور اس کے احکام کی بلاچون و چرا تابعداری پر منحصر ہے۔ کلیسیا کا یہ اقتدار اعلیٰ پروٹسٹنٹ فرقے کے آغاز تک قائم رہا۔ کار تھیج کے مشہور متکلم سپرین (Cyprian) نے جو اوریجن کا ہم عصر تھا' اس رجحان کی تائید کی اور اس کے جواز کے لیے عقلی دلائل پیش کیے۔ اس نے حضرت عیسیٰ کے انجیل میں مذکور ان اقوال کا حوالہ دیا جن میں انہوں نے پطرس پر ایک خاص ذمہ داری عائد کی تھی اور اسے ایک خصوصی اقتدار کا حقدار بنایا تھا۔ مشہور ہے کہ پطرس ہی رومی کلیسیا کا بانی اور پہلا حاکم تھا۔ اس کے نزدیک جو عیسائی جماعت اس نظریے سے منکر ہوگی وہ روحانی زندگی کے سرور سے عاری رہے گی۔ "وہ شخص جس نے کلیسیا کو اپنی ماں نہیں سمجھا اس کے لیے خدا بطور باپ نہیں بن سکتا۔"

آگسٹائن کا کلامی نظام

آگسٹائن (۳۵۴-۴۳۰ء) کے ہاں وہ تمام مختلف نظریات جو مغربی دنیا کی مذہبی تاریخ میں صدیوں تک کار فرما رہے' ایک منظم' مربوط اور واضح فلسفیانہ شکل میں ملتے ہیں۔ اس کی تعمیری اور تخلیقی قوت کے باعث عیسوی علم کلام کے تمام مسائل اور ان پر بحث و تمحیص کی تمام شکلیں ایک باقاعدہ اور منظم شکل میں سامنے آگئیں اور ان مسائل کے وہ حل جو بعد میں کیتھولک فرقے کے اکثر حکماء و متکلمین کے لیے ناقابل قبول تھے' واضح طور پر بیان کردیے گئے۔ اکثر معاملات میں تو پروٹسٹنٹ فرقے نے بھی آگسٹائن کے ان مسائل اور ان کے حل کو قبول کیے رکھا' حتیٰ کہ جہاں کہیں بعد میں خاص طور پر تیرہویں صدی عیسوی میں آگسٹائن کے نظریات سے

تھوڑا بہت اختلاف کیا گیا تھا اس انقلاب نے وہ تمام بعد کے تصورات ترک کرکے آگستائن کے پیش کردہ خالص نظریات کو پھر سے قبول کیا۔

آگستائن کے نظریات کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم یہ چیز ذہن نشین کرلیں کہ مختلف رجحانات جن میں اس نے ہم آہنگی پیدا کی' اس کے نظام کے تین بڑے عناصر سے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ اس کی تعمیری قوت اور تخلیقی صلاحیت کا ثبوت ہے کہ اس نے ان متفرق عناصر کو ایک مستقل وحدت میں سمو دیا۔ یہ صحیح ہے کہ وہ ان میں کلی منطقی تطابق پیدا نہ کر سکا اور اس لیے ہر عقیدہ کی بحث میں اس کے ہاں بظاہر مختلف اور متضاد نظریات کا پایا جانا ممکن ہے' لیکن کم از کم وہ اصول جن کی مدد سے وہ ان تناقضات کو رفع کرنے کی کوشش کرتا ہے' بالکل واضح اور صاف شکل میں (کم از کم اس کے آخری زمانے کی تصنیفات میں) موجود ہیں۔ ان میں ایک تو یونانی فلسفہ کا نچوڑ اور خلاصہ ہے یعنی نو افلاطونیت جو عیسائی نظریات سے بہت مطابق تھا۔ دوسرا وہ اخلاقی عنصر تھا جو اسرائیلی انبیاء کی تعلیم اور ان کی دینی زندگی کے نمونے سے حاصل ہوا تھا۔ اس کا سرچشمہ آگستائن کی اپنی مذہبی زندگی کی کش مکش میں بھی مضمر تھا۔ تیسرا اصول حاکمیت اور اقتدار کا تصور تھا جسے ہم اس کے علم کلام کے رومی عنصر سے تعبیر کرسکتے ہیں۔ ہم ذیل میں آگستائن کے ان تینوں اصولوں سے تفصیل سے بحث کریں گے۔

آگستائن جیسے وسیع النظر انسان کے لیے مختلف فلسفیانہ افکار سے متاثر ہونا اور پھر ان میں تطابق پیدا کرنا ایک بدیہی امر ہے۔ عیسائیت قبول کرنے سے پہلے وہ مختلف عقائد اور افکار کا گرویدہ رہا۔ کبھی سسرو کے نیم رواقی فلسفہ (Stoicism) کا گرویدہ تھا تو کبھی مانی کی ثنویت کا' کبھی تشکیک کے زیر اثر آیا اور کبھی نوافلاطونیت سے متاثر ہوا۔ مانوی مذہب سے وہ آخرکار بری طرح مایوس ہوا اور اس کو کلی طور پر مردود قرار دیا۔ تشکیک کے چکر سے نکلنے کے لیے اس نے یہ بہترین نسخہ تجویز کیا کہ کلیسیا کی تعلیم کے ذریعے ایک مافوق الفطرت نوریقین حاصل کیا جائے۔ نوافلاطونیت اور رواقیت کا اثر آخر دم تک اس پر نمایاں رہا۔ ہر بڑے کلامی مسئلہ کی بحث میں نوافلاتی اثر نظر آتا ہے اور اس کے باعث یہ فلسفہ عیسوی فکر کا جزو لاینفک بن گیا۔

آگستائن کے علم الکلام میں ایک مرکزی تصور نوافلاطونیت کے زیر اثر قائم ہوا' اور یہ تھا خدا کا وہ تصور جس کے باعث وہ تمام خیر کا سرچشمہ ہے' لیکن فلاطینوس کے ہاں مکمل ماورائیت تھی جسے آگستائن قبول نہ کر سکا' کیونکہ جب خدا ماورالماوراء ہو تو اس کے اور انسانوں کے درمیان کوئی رشتہ ممکن نہیں رہتا اور پھر کسی علم کلام کی ضرورت ہی نہیں رہتی' لیکن وہ تمام

کائنات کی بنیاد اور علت ہے جس کی تخلیقی قوت کے باعث کائنات کی ہر شے نے وجود پایا اور خیر ظہور پذیر ہوا۔ یہ نتیجہ اس مفروضہ پر مبنی ہے کہ وجود اپنی ذات میں خیر ہے اور شر کوئی ایجابی شے نہیں' بلکہ صرف خیر کے عدم سے عبارت ہے۔ اس طرح صرف خدا ہی حقیقی وجود' حقیقی جوہر کل اور حقیقی خیر ہے۔ ماسواء اللہ غیر حقیقی اور شر ہے۔ خدا اس زمان و مکان میں محیط اور قادر مطلق ہے۔ وہ کلی طور پر ہر جگہ ہے اور اس کے باوجود وہ کسی جگہ اور شے میں محدود نہیں' کیونکہ وہ ہر ایجابی شے کا سرچشمہ ہے۔ اس کی ذات سے تمسک زندگی ہے اور اس سے دوری موت۔

ہر مذہبی مسئلے کی بحث میں آگسٹائن کا یہ تصور خدا کہ وہ قادر مطلق ہے' کارفرمارہا ہے۔ اس کے نزدیک خدا نے یہ کائنات عدم سے تخلیق کی' کیونکہ خدا کے علاوہ کوئی فعال علت موجود نہیں۔ اس کی ربوبیت کا تقاضا یہ ہے کہ اس کی مرضی کے بغیر کوئی نئی چیز پیدا نہیں ہوسکتی اور ہر چیز اپنے وجود کے لیے اس کی مرہون منت ہے۔ اسی پر اس کے نظریہ فضل الٰہی (GRACE) اور نظریہ تقدیر کا دارومدار ہے۔ چونکہ خدا کے بغیر انسان کچھ نہیں' اس لیے ایمان کا پہلا بیج جو اسے نجات کی طرف لے جاتا اور اس کی روح کی تازگی کا باعث بنتا ہے صرف خدا کی بخشش کا نتیجہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ بعض لوگوں کو نجات کا راستہ مل جاتا ہے اور بعض اس سے محروم رہتے ہیں' ایک ایسا خدائی عمل ہے جس کی کنہ تک پہنچنا انسانی عقل کا کام نہیں' خدا نے بعض لوگوں کی قسمت میں سعادت لکھ دی ہے اور وہی نجات پاتے ہیں' لیکن خدا سب انسانوں سے یکساں انصاف سے پیش آتا ہے اور ان کے ساتھ وہ کچھ پیش آتا ہے جن کے وہ مستحق ہیں۔ گناہ گاروں کو جو کچھ پیش آتا ہے وہ اسی کے سزاوار ہیں' لیکن بعض کے نزدیک خدا رحم دل بھی ہے۔ وہ انسانوں کے دلوں میں نیکی کا بیج بوتا ہے جس کے باعث وہ ابدی خوشی کے وارث بنتے ہیں۔ اسی نظریے نے مسیحی محبت کا تصور اور نجات کی ماہیت متعین ہوئے۔ محبت اس کے نزدیک اساسی طور پر انسان کے لیے بھلائی کا تصور نہیں' بلکہ خدا کی عظمت کے احساس اور اس کی تابعداری کا نام ہے۔ جب انسانی روح اپنی زندگی کے سرچشمہ کی شکرگزار ہوتی اور اس کے احکام کے آگے اپنی مرضی سے سرتسلیم خم کرتی ہے تو یہی حالت محبت کے نام سے موسوم ہوتی ہے۔ نجات سے مراد مشاہدۂ خداوندی کی ناقابل بیان سعادت ہے۔ یہ وہ منزل ہے جہاں انسانی روح ہر قسم کی غیر حقیقی مادی آلائشوں اور شروں سے ہمیشہ کے لیے پاک ہو جاتی ہے۔ یہ ذات خداوندی سے وصال ہے جس کا ایک ناقص سا تجربہ ہمیں اس دنیا میں حالت جذب میں ہوتا ہے'

لیکن جس کی صحیح نوعیت کا علم صرف موت کے بعد ہی حاصل ہو سکتا ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ ایک منظم علم کلام اور دینیاتی فکر صرف نوافلاطونیت کی مدد ہی سے تیار ہوسکتا تھا۔ ایسا فکر یقیناً" منطقی طور پر زیادہ مربوط اور ہم آہنگ ہوتا بہ نسبت اس دینیاتی فکر کے جو آگسٹائن نے پیش کیا' لیکن آگسٹائن فلسفی نہ تھا جس کے سامنے صرف منطقی تقاضے ہی ہوتے۔ اس کے سامنے اگر ایک طرف یونانی فکر تھا تو دوسری طرف اسرائیلی انبیاء کی بلند مذہبی روایات بھی تھیں۔ اس کی زندگی کی مذہبی کش مکش اور روحانی کرب وابتلا نے اسے موخر الذکر کی اہمیت کا زیادہ احساس دلایا جس کے باعث اس کے کلامی فکر میں نوافلاطونیت سے زیادہ اسرائیلی روایات مذہبی کا تتبع پایا جاتا ہے۔ بعض جگہ مختلف مسائل پر بحث کرتے ہوئے ان دونوں نظریات کا تضاد کھل کر سامنے آجاتا ہے اور آگسٹائن کو ان میں سے ایک کا انتخاب کرنا پڑتا ہے۔ تقریباً" ہر ایسے موقع پر اسرائیلی مذہبی روایات کا پہلو نمایاں رہا اور یونانی فکر کا مابعد الطبیعی وحدانی نقطہ نگاہ (خاص کر بعد کی کتابوں میں) ثانوی حیثیت کا حامل تھا۔

آگسٹائن کی والدہ عیسائی تھی اور اس کی دلی خواہش تھی کہ اس کا لڑکا اس مذہب کو قبول کرلے' لیکن کئی سالوں تک کلیسیا کے خلاف بغاوت کا جذبہ حاوی رہا۔ ایک طرف علم و فضل کا غرور اور دوسری طرف ہوائے نفسانی کی پیروی -- ان دونوں کے باعث وہ کلیسیا کی حاکمیت سے اباء کرتا رہا' اگرچہ اس کا دل اس کی صداقت کی گواہی دیتا تھا۔ اس ذاتی جد و جہد کے تجربے کے زیراثر اس کے دل میں خدا اور انسان کا ایک ایسا تصور قائم ہوا جس میں "ارادہ" کا عنصر غالب تھا۔ جو انسان حقیقت اور صداقت کا شعور رکھتے ہوئے بھی اس کے خلاف بغاوت کرسکتا ہے' جو اپنی نفسانی خواہشات کی تسکین کی خاطر صحیح راستے پر گامزن ہونے سے گھبراتا ہے' یقیناً" وہ ذات محض ایک مابعد الطبیعیاتی عدم وجود نہیں کہلا سکتی۔ یہی وہ قوت ارادی ہے جو ہر انسان کے عمل اور نیت کا سرچشمہ اور منبع ہے۔ آگسٹائن کے نزدیک اسرائیل کی مذہبی روایات اور انبیاء کی زندگیاں اسی نظریہ کی تائید کرتی نظر آتی ہیں۔ اس کو قبول کیے بغیر اسرائیل کی مذہبی تاریخ کو سمجھنا محال معلوم ہوتا ہے۔ وہاں خدا کا تصور ایک ایسی ذات کا ہے جو صاحب ارادہ ہے اور حاکمیت مطلقہ کی حامل ہے' جس نے بنی اسرائیل کے لیے ایک خاص منصب متعین کیا ہے اور ان کے ذریعے تمام بنی نوع انسان کے لیے ایک خاص پیغام اور قانون نازل کیا ہے۔ اس کے ہر کام میں ایک مقصدیت کارفرما ہے جو ارادے کا بہترین مظہر ہے۔ انہوں نے یا تو اس پیغام اور قانون کو قبول کیا اور اس کے نتیجے میں دنیا اور آخرت کی تمام سرفرازیاں ان کے حصے میں آئیں

یا اس سے انحراف کیا' اپنے برے اعمال کے نتائج سے دوچار ہوئے اور مختلف انبیاء نے انہیں خدا کی وعید سے ڈرایا اور راہ راست پر دوبارہ چلنے کی ترغیب دی۔ اس نقطہ نگاہ سے ایک ایسا علم کلام ظاہر ہوا جو پہلے علم کلام سے بالکل مختلف تھا۔ نوافلاطونی تصور خدا کی جگہ -- جس کے مطابق وہ محض تمام وجود کی کائناتی علت ہے -- ایک ایسے خدا کا تصور پیدا ہوا جو شخصی صفات کا حامل تھا' جس سے ہم رابطہ اور تعلق پیدا کرسکتے ہیں' خواہ وہ تعلق دوستی کا ہو یا دشمنی کا' جو ہم سے محبت بھی کرتا ہے اور ہماری راہنمائی بھی اور جس سے ہم محبت بھی کرسکتے ہیں اور اس کے احکام کی تعمیل کرکے اس کی رضا بھی حاصل کر سکتے ہیں۔ جب آگسٹائن بعد میں کلیسیا کا رکن ہو گیا تو اس نے اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی میں اسی نظریے کو سامنے رکھا۔ اس کے حلقہ ارادت میں اکثریت ایسے لوگوں کی تھی جو اسی قسم کے تصور خدا سے تسکین حاصل کرسکتے تھے۔

ان دونوں تصورات کے تضاد کا اظہار مسئلہ شر اور چنداں دوسرے مسائل میں نمایاں ہوتا ہے جن کا ذکر نوافلاطونیت کے ذیل میں کیا جاچکا ہے۔ اگر خدا کے شخصی تصور کو تسلیم کر لیا جائے تو شر عدم محض نہیں رہتا' ایک حقیقی اور فعال قوت بن جاتا ہے' بلکہ یوں کہنا زیادہ بہتر ہوگا کہ وہ بے شمار حقیقی اور فعال قوتوں کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ گویا کہ وہ تمام افراد جو اپنی قوت ارادی سے خدا کی رضا اور اس کے پسندیدہ راستے کی مخالفت پر کمربستہ نظر آتے ہیں وہ اسی قوت شر کے مختلف مظاہر ہیں۔ اس طرح نوافلاطونی وحدانی نظریہ ختم ہو جاتا ہے۔ ہماری زندگی کا یہ مقصد نہیں کہ ہم اپنے اور اس تمام کائنات کے وجود کو اس وحدت مطلقہ کے وجود پر منحصر سمجھیں اور اس کے مشاہدہ ذات میں مستغرق ہوں' بلکہ اپنے نفس کے باغیانہ رجحانات کو ختم کرکے اس کی فرماں برداری میں منہمک ہو جائیں۔ اس کے نزدیک انسان کی نجات اس کی داخلی کش مکش پر خدا کے فضل و بخشش کی مدد سے فتح پانے میں مضمر ہے۔ محض ایک خشک اور بے رنگ فلسفیانہ وحدت سے رابطہ پیدا کرنے کی کوشش اس کے نزدیک ایک بے کار مشغلہ ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جہاں کہیں یہ دونوں نظریات متصادم ہوئے ' آگسٹائن نے ہمیشہ دوسرے نظریے (یعنی خدا کے شخصی تصور) کو ترجیح دی۔

اس سے انکار کی مجال نہیں کہ تقریباً" ہر مذہبی مسئلہ میں نوافلاطونی فکر نے کوئی نہ کوئی اثر ضرور ڈالا اور اس کے تصورات کو ایک خاص شکل دی' تاہم یہ حقیقت اپنی جگہ ناقابل تردید ہے کہ اس نے ہر جگہ خدا کے اس شخصی تصور کو قابل ترجیح جانا۔ جب انسان خدا سے منقطع ہوتا

ہے تو وہ محض عدم نہیں ہوجاتا' بلکہ ایک باغی بن جاتا ہے۔ اپنے مابعدالطبیعی وجود کے لیے وہ خدا کی ذات پر منحصر نہیں' بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اپنی اخلاقی اور روحانی اصلاح کے لیے وہ اس ذات کا دست نگر ہے۔ خدا کی مدد کے بغیر اس سے نیکی کا اظہار ناممکن ہے' صرف بدی اور شر ظاہر ہوسکتا ہے۔ ہر انسان خدا کی بخشش اور عنایت کا محتاج ہے' اس لیے نہیں کہ وہ اپنے وجود کو برقرار رکھ سکے' بلکہ اس لیے کہ غرور کا سرنیچا ہوسکے جو تمام گناہوں کی جڑ ہے۔ اور خدا کا فضل و کرم ہماری مزاحمت سے بالا ہے' اس لیے نہیں کہ انسان کا وجود عدم کے برابر ہے بلکہ اس لیے کہ خدا کی ارادی قوت لامحدود ہے۔ اس نقطۂ نظر سے محبت کا مفہوم یہ نہیں کہ دنیاوی زندگی سے کلی طور پر دست بردار ہوکر خدا کی ذات سے لو لگائی جائے' بلکہ اس کی رضا کے آگے مکمل طور پر سرتسلیم خم کردیا جائے۔ خدا احکم الحاکمین ہے اور انسان اس کی رعایا' اور نجات کا دارومدار جوہر کلی میں مدغم ہونا نہیں' بلکہ اپنی رضا کو اس کی رضا میں گم کرنا ہے۔ جنت جذب و انبساط کی ایک انفعالی کیفیت کا نام نہیں' بلکہ خدا کے آفاقی مقصد کی تکمیل میں ایک فعال تعاون کا نتیجہ ہے۔ آگسٹائن کی مشہور دعا کے الفاظ نوافلاطونی فکر اور اسرائیل کی مذہبی روایات کے باہمی ربط کے آئینہ دار ہیں۔ "اے خدا! تو نے ہمیں جگایا تاکہ ہم تیری مناجات سے لذت پذیر ہوں۔ تو نے ہمیں اپنی ذات کے لیے پیدا کیا اور ہمارے دل ہمیشہ سرگرداں اور پریشان رہتے ہیں جب تک تیری ذات میں انہیں سکون نصیب نہیں ہوتا"۔ (اعترافات-۱۰۱)

آگسٹائن کا بلند ترین کارنامہ یہی ہے کہ اس نے ان دونوں تصورات کو اس طرح ایک وحدت میں سمویا کہ اس وحدت میں اسرائیلی روایات کا پلہ بھاری رہا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے سامنے انسان کی مذہبی زندگی کے نظری اور عملی تقاضے دونوں تھے اور اس کی خواہش تھی کہ ان دونوں تقاضوں کی یکساں طور پر تسکین ہو سکے۔ اگرچہ اس کے نظام فکر میں نظری کے مقابلہ پر عملی اور اخلاقی پہلو کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ عملی پہلو کی یہ برتری اس کے نظریہ علم کی تشکیل پر خاص طور سے اثر انداز ہوئی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عیسائیت قبول کرنے سے پہلے بھی نوافلاطونی فلسفہ نے اس کی تشکیک کو رفع کرنے میں کوئی مدد نہ کی۔ چونکہ خدا انسان کے لیے خیر کل یا خیر مطلق ہے' اس لیے اس کے لیے عقل ہی صداقت کا آخری معیار ہے' لیکن دوسری طرف خدا کی توفیق کے بغیر انسان صداقت کی تلاش کر ہی نہیں سکتا' کیونکہ گناہ ہر لمحہ اس کو راہ راست سے بھٹکاتا رہتا ہے۔ وہ ایک غلطی سے نکل کر دوسری میں پھنس جاتا ہے اور اس کے لیے کسی یقین تک پہنچنا ممکن نہیں۔ صرف اس وقت جب توفیق و تائید ایزدی اس کے

شامل حال ہو اور اس کی قوت ارادی کی رہنمائی کرے جس کے باعث علم و فضل کا غرور اور دوسری نفسانی خواہشات فنا ہو جاتی ہیں تو اس وقت وہ صداقت تک پہنچ سکتا ہے' کیونکہ یہی وہ موقع ہے جب حکمت خداوندی کے نور کی شعاعیں اس کے قلب کو منور کرتی ہیں۔ علم محض عقلی نہیں' بلکہ اخلاقی بھی ہے۔ صداقت کی بصیرت صرف اس وقت حاصل ہوتی ہے جب انسان اپنی انفرادی رضا کو خدائے مطلق کی رضا کے ماتحت کر لے اور اس کے بعد ہی صداقت سے ایک صحیح محبت اور اس کی تلاش کی تڑپ پیدا ہوتی ہے۔ یقین محض عقلی اور استدلالی غور و خوض کا نتیجہ نہیں' بلکہ اخلاقی اور روحانی انقلاب کا ثمرہ ہے۔ یہی نظریہ بعد میں پروٹسٹنٹ فرقے کا مرکزی تصور بن گیا۔

لیکن آگسٹائن کے فلسفے کا ایک تیسرا لازمی عنصر بھی ہے جو مذکورہ بالا دونوں نظریات پر حاوی ہے۔ جب اس نے پرانی زندگی اور پرانے عقائد سے توبہ کی تو اس نے نہ صرف عیسائیت کو قبول کیا' بلکہ عیسوی کلیسیا کی حاکمیت کو بھی تسلیم کیا۔ اس نے عیسائیت کی پیش کردہ صداقت کو آخری اور قطعی صداقت کے طور پر اختیار کیا اور اس کے ساتھ کلیسیا کے کلی اقتدار کے آگے سر تسلیم خم کیا۔ رومی ذہن کی خصوصیت ہی تنظیم' وحدت اور ضبط ہے اور آگسٹائن میں یہ صفت فطری طور پر موجود تھی۔ چنانچہ اس کے باعث اس نے جب عیسائیت کو اختیار کیا تو اس کے ساتھ ہی کلیسیائی حاکیت اور کلیسیائی ضبط و نظام کو ایک حقیقت کے طور پر تسلیم کرنا ایک فطری امر تھا۔ اس زمانے میں معاشرتی یک جہتی اور ہم آہنگی کا انحصار اسی قسم کے نظام وحدت سے وابستہ سمجھا جاتا تھا' اس لیے آگسٹائن کے نزدیک عیسائیوں کو متحد اور مجتمع کرنے اور رکھنے کے لیے کلیسیائی نظام سے بہتر کوئی اور ادارہ ممکن نہ تھا۔ اس کے علاوہ اس کے ذہن میں یہ تصور بھی کارفرما تھا کہ انسان اور خدا کے درمیان ایک زندہ واسطے کی ضرورت ہے تاکہ عیسوی مذہب کے پیروؤں کی اخلاقی اور روحانی نشوونما کا مناسب بندوبست ہوسکے۔ جب تک معاشرتی راہنمائی کے لیے مناسب اور مروجہ طریقے موجود نہ ہوں' انفرادی ایمان اور انفرادی کوششیں کامیاب نہیں ہوسکتیں۔ ایسے وقت جب رومی سلطنت کا شیرازہ بکھرنے ہی والا تھا' آگسٹائن کی نگاہ میں کلیسیائی نظام کی وحدت اور اس کی حاکیت دنیاوی اور دینی نقطۂ نگاہ سے بہترین بدل تھا۔ یہی وہ ذریعہ تھا جس کے باعث اس مذہب کے پیرو ایک روحانی وحدت میں منسلک ہوسکتے تھے۔ بعد میں جب عیسائیت کے اعتقادات میں اختلافات رونما ہونے لگے اور کئی نئے بدعتی فرقے پیدا ہوئے (مثلاً" دوناطسی فرقہ) تو اسے محسوس ہوا کہ کوئی فرد اپنے ذاتی تجربات کی روشنی میں یہ فیصلہ کرنے

کا مجاز نہیں کہ جو کچھ نور بصیرت سے اسے حاصل ہوا ہے وہ حق ہے۔ اس الہام و کشف میں کوئی ایسی ناقابل انکار علامات موجود نہیں ہوتیں جن سے ان کے حق ہونے کا ثبوت مہیا ہوسکے۔ اس لیے ان پر اعتماد کرتے ہوئے مذہبی معاملات میں مسائل کا فیصلہ قابل عمل نہیں۔ ایسی حالت میں ایک ایسے ادارہ کا قیام ناگزیر ہے جو عوام کے سامنے خدا کے احکام کی صحیح تاویل و تشریح پیش کر سکے' جو خدا اور انسان کے درمیان واسطے کا کام دے سکے۔ یہی حق و صداقت کا معروضی معیار ہے۔ بائبل بلاشک و شبہ ہر قسم کی غلطیوں سے بالا اور پاک ہے' لیکن کلیسا کی حاکمیت بائبل سے بھی زیادہ ہے' کیونکہ یہ کلیسیا کا کام ہے کہ وہ بتائے کہ کون کون سے صحیفے بائبل کا حصہ ہیں اور ان کی تاویل کس طرح کی جائے۔ کلیسیا گویا مسیح کا زندہ جسم ہے اور اس دنیا میں اس کا نمایندہ اور نائب۔ وہ عقلی اور اخلاقی طور پر ہر قسم کی غلطی اور فروگزاشت سے بالا ہے۔ عیسائیوں کا فرض ہے کہ وہ اس کی حاکمیت اعلیٰ کو تسلیم کریں۔ جن عقاید اور اعمال کے متعلق وہ فیصلہ کرے کہ درست ہیں' انہیں کو صحیح سمجھ کر اختیار کرے۔ آگسٹائن کے نزدیک کلیسیا کو سیاسی اقتدار کا حامل بھی ہونا چاہیے' کیونکہ بطور "شہرخداوندی" وہ دنیاوی شہر یعنی روم سے برتر ہے اور ایک زمانہ آنے والا ہے جب موخر الذکر ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا' لیکن اول الذکر یعنی شہر خداوندی کی حکومت ہمیشہ رہنے والی اور پائدار ہے۔

اس تصور نے بھی آگسٹائن کے علم کلام کی تشکیل میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ ہر مسئلے پر بحث کرتے ہوئے اس کے سامنے یہ تینوں پہلو تھے۔ کہاں تک یہ فلسفیانہ وحدت کو برقرار رکھ سکتا ہے۔ انسان کی روحانی اور اخلاقی کش مکش کو کامیابی سے ختم کرنے میں کہاں تک ممد و معاون ہو سکتا ہے اور آخر میں یہ تصور بھی اس کے سامنے موجود تھا کہ کلیسیا کا وجود برقرار رہنا چاہیے تاکہ وہ خدا اور انسان کے درمیان واسطے کے طور پر کام آسکے یا جو "کشتی نجات" بن سکے۔ اور جب کبھی دوسرے دو پہلوؤں اور اس تیسرے پہلو میں تصادم نظر آیا تو یہ تیسرا پہلو ہمیشہ حاوی رہا۔ چنانچہ وہ منظم علم کلام جو آگسٹائن نے اپنے جانشینوں کو دیا' اس میں جو کچھ وحدت نظر آتی ہے وہ اسی کلیسیائی تصور کے باعث ہے۔ اس حیثیت میں گویا خدا مسیح کی وساطت سے کلیسیا کا بانی ہے جس نے لوگوں کی نجات کی تمام تر ذمہ داری اس پر ڈال دی ہے اور جو کوئی اس سے منسلک نہیں وہ نجات کا بھی مستحق نہیں۔ خدا کا فضل و کرم صرف چند رسوم کی ادائیگی سے حاصل ہوسکتا ہے اور یہ رسوم صرف کلیسیا کے زیرہدایت ادا ہونے سے ہی موثر ہوسکتی ہیں۔ یہ مقدس رسوم جن میں بپتسمہ اور عشاء ربانی عوام کے لیے زیاہ اہم ہیں' اس حقیقت کی علامت

ہیں کہ انسان کے قلب میں روحانی قوتیں کارفرماہیں۔ وہ "ملکوتی دنیا کے ناسوتی آثار" ہیں، لیکن ان کی اہمیت محض علامتی نہیں۔ اگر کلیسیا کے مقررکردہ افراد کے زیر ہدایت ان رسوم میں شرکت کی جائے تو وہ نجات کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔ اس کے بغیر نجات ممکن ہی نہیں۔ اسی طرح نیکی اور تقویٰ (VIRTUE) کے عیسوی تصور میں ایک تبدیلی ظاہر ہوتی ہے۔ خدا سے محبت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ کلیسیا جو خدا کا نائب یا خلیفہ ہے، کی حاکمیت کو تسلیم کرے۔ بھائیوں سے محبت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ کلیسیا کے نافذ کردہ عقائد کو بلاچون و چرا تسلیم کرے تاکہ کلیسیا کی وحدت برقرار رہے۔

آگسٹائن کا دوسرا کارنامہ بہ حیثیت عیسوی متکلم یہ تھا کہ اس نے مذکورہ بالا دونوں اصولوں کی روشنی میں مذہب کے شخصی نظریہ کے ساتھ کلیسیا کو ایک ناگزیر سماجی ضرورت کی حیثیت میں پیش کیا۔ ایسا کلیسیا جو خدا کے حکم سے حاکمیت کلی کا حامل تھا۔ جیسا کہ ذکر کیا جاچکا ہے آگسٹائن کے نظام فکر میں کائنات کی تصویر اور انسانی زندگی کا تمام نقشہ اسی تیسرے تصور کے اردگرد گھومتا ہے۔

آخر میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم آگسٹائن کے نظام فکر کے چند ان عناصر کو مختصر طور پر بیان کریں جن سے زیادہ وضاحت سے معلوم ہوجائے گا کہ اس نے ان تینوں مختلف نظریات کو کس طرح ایک وحدت میں سمو دیا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوسکے گا کہ کس طرح اس کے نظام کی خصوصی شکل سے وہ تمام مسائل متشکل ہوئے جو صدیوں سے مغرب کی عیسائی دنیا میں زیر بحث چلے آرہے ہیں۔ یہ خلاصہ فلسفیانہ یا نفسیاتی ہونے کی بجائے زیادہ تر تاریخی ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے تینوں مختلف عناصر میں جو ہم آہنگی اور مطابقت نظر آتی ہے وہ اس کے نظریہ تاریخ ہی کے باعث ہے۔

سب سے پہلا عنوان یقیناً" خدا ہے جو حقیقت کلی اور خیر مطلق ہے۔ خدا کی اساسی صفات وحدت، سادگی، ازلیت، کمال، لامحدودیت ہیں۔ یہ صفات ایجابی ہیں، تاہم وہ انسانی فہم و تفہیم سے ماوراء ہے۔ وہ قادر مطلق ہے، ربوبیت کے باعث وہ ہر جگہ حاضر ہے۔ وہ انسانوں کے لیے معیار صداقت ہے اور اس لیے علیم ہے۔ وہی اس کائنات میں خیر کا مصدر ہے۔ اس کے وجود کے اثبات میں آگسٹائن نے تقریباً" تمام وہ اساسی دلائل (سوائے اس دلیل کے جو کانٹ نے پیش کی) بڑی وضاحت سے پیش کیے ہیں جو بعد کے متکلمین کے ہاں موجود ہیں، لیکن وہ تسلیم کرتا ہے کہ توفیق ایزدی کے بغیر محض ان دلائل سے مطمئن ہونا ہر شخص کے لیے ممکن نہیں۔ انسان کی عقل

تشکیک کا واحد علاج نہیں۔ خدا کے فضل کے بغیر انسان عقلی اور اخلاقی طور پر لاچار ہے۔

خدا نے اپنی شان کبریائی کو ظاہر کرنے کے لیے یہ دنیا عدم سے تخلیق کی۔ یہ عمل تخلیق ایک خاص وقت میں ظاہر ہوا' اور وقت اسی عمل تخلیق کا نتیجہ ہے۔ خدا کی ربوبیت اس کائنات کے قیام و بقاء میں ہر وقت مصروف عمل ہے۔ اس کے بغیر یہ تمام دنیا فنا ہوجاتی۔

انسان کی تخلیق ایک مادی جسم اور غیرمادی روح کی آمیزش سے ہوئی۔ روح کی مرکزی قوت ارادہ ہے۔ فطرتاً" انسان کا ارادہ نیکی اور خدا کی طرف مائل تھا' لیکن چونکہ اسے انتخاب کا اختیار دیا گیا تھا' اس لیے آدم نے گناہ کا راستہ اختیار کیا اور اس طرح اس نے فطری نیکی کو ضائع کر دیا۔ آدم کا گناہ نفسانی خواہش کا نتیجہ نہ تھا' بلکہ نفسیاتی بیماری یعنی غرور تھا۔ اس نے حوا کا پیش کردہ سیب اس لیے نہیں کھایا کہ وہ بھوکا تھا' بلکہ اس لیے کہ اس نے اپنے آپ کو خدا کے احکام کی تابعداری سے بالا سمجھا۔ اس نے خدا کی بجائے اپنے آپ کو قابل تکریم جانا۔ اس گناہ کے باعث وہ خدا کی توفیق سے محروم ہوگیا' اور نیکی اور بھلائی کی صلاحیت اس سے چھن گئی۔ اس کے بعد اس کے سامنے گناہ اور آلودگی کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔ خدا کی توفیق اور اس کے فضل کی محرومی اور گناہ اور آلودگی کی زندگی کے باعث وہ ابدی زندگی سے محروم اور موت کا شکار ہوگیا۔

آدم کی فطرت میں اب شر حاوی ہوا اور اس کا اظہار ہر قسم کی نفسانی خواہشات کے ذریعے ہوتا رہا۔ بنی آدم کو یہی فطرت بد ورثے کے طور پر ملی اور اسی کے باعث ان سے ہمیشہ مختلف قسم کے گناہ سرزد ہوتے رہتے ہیں۔ انسانوں کو گمراہ کرنے والا وہی ابلیس ہے جو ابتدا میں تو فرشتہ تھا' لیکن جس نے اپنے متبعین سمیت خدا سے بغاوت کی اور توفیق ایزدی سے ہمیشہ کے لیے محروم ہوگیا۔ وہ خدا سے دشمنی کا اظہار کمزور لوگوں کو نیک راہ سے بہکانے سے کرتا ہے۔ انصاف کی رو سے گناہوں کی سزا ناگزیر ہے۔ اس لیے اگر محض انصاف کے نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو انسان کی زندگی ناقابل رشک ہے' لیکن دوسری طرف خدا قادر مطلق ہے۔ شیطان اوراس کے پیروؤں کی بغاوت اس کی آفاقی تدبیر اور اس کے کائناتی مقصد کے آگے کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ بے شک شیطان اور اس کی ذریت ہمیشہ کے لیے مبغوض ہے' لیکن اس نے انسانوں کو نجات دینے اور ان کو جنت میں داخل کرنے کا ایک طریقہ تیار کیا۔ اس کی بے پایاں رحمت ان پر نازل ہوتی ہے' ان کے دل میں ایمان پیدا ہوتا ہے' پھر وہ ان کے فطری گناہ اور کردہ گناہ سب کو معاف کردیتا ہے اور آہستہ آہستہ وہ نیک بن جاتے ہیں۔ اس کا اظہار یوں ہوتا ہے کہ وہ اپنی

ساری زندگی خدا کے احکام کی بجا آوری میں پورے خلوص سے منہمک رہتے ہیں۔ نجات کے لیے یہ سارے ناگزیر اقدام محض خدائی توفیق کا نتیجہ ہیں۔ اس میں انسان کے ارادے اور کوشش کا کوئی دخل نہیں۔ مکمل جبریت کا یہ نظریہ جس میں انسان محض لاچار بن کر رہ جاتا ہے' اگرچہ آگسٹائن کے نظام فکر کا ایک لازمی جزو ہے' تاہم بعد میں کیتھولک علم کلام میں قبولیت حاصل نہ کرسکا اگرچہ پروٹسٹنٹ فرقوں میں اسے قبول کر لیا گیا۔

لیکن نجات کا یہ عمل کسی ایک فرد کی نفسیاتی زندگی کا عمل نہیں۔ خدا اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے عام طور پر انفرادی ذرائع کی بجائے سماجی ذرائع استعمال کرتا ہے۔ چونکہ آدم کی لغزش سے چند ناگزیر تاریخی اور سماجی نتائج پیدا ہوئے' اس لیے اس کی توفیق اور رحمت کا اظہار بھی تاریخی عوامل اور معاشرتی ذرائع سے ممکن ہے۔ اس طرح خدا نے ایک خاص قوم یہود کو منتخب کیا' تاکہ اسے اپنی رضا کی خبر دے اور پھر ان میں سے ایک کی شکل میں ظاہر ہوا' تاکہ لوگوں کی نجات کا راستہ کھل جائے۔ اوتاری کے اس عقیدے کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ انسان پھر ایک دفعہ فطرت الٰہیہ میں شریک ہوگیا جس سے آدم گناہ کے باعث محروم ہو چکا تھا۔ مسیح کے مصلوب ہونے سے کفارہ کا مفہوم یہ ہے کہ اس سے خدا کا انصاف پورا ہوگیا اور اس طرح عام انسان اس کے غضب سے محفوظ ہو گئے۔ مسیح نے عجز' صبر اور خدا کے احکام کی فرماں برداری کا بہترین نمونہ پیش کیا اور خدا نے دنیا سے اپنی محبت کی شاندار مثال مہیا کی۔ مسیح کی زندگی کا سب سے بہترین کارنامہ یہ ہے کہ اس نے کلیسیا کی بنیاد رکھی اور اس کا پہلا سربراہ مقرر ہوا۔ یہ کلیسیا اس کا جسم اور آئندہ زمانے میں اس دنیا میں اس کا نائب ہے۔ یہودیوں نے مسیح سے انکار کیا اور اس طرح ان کا خصوصی تاریخی کارنامہ ختم ہو گیا۔ کلیسیا کے قیام اور عالمگیر اشاعت سے ایک نئے دور کا آغاز ہوا جس کی سربراہی عیسائی کلیسیا کے نام ہے۔ مسیح نے کلیسیا کو کلی اختیار دیا کہ وہ انسانی روح کو قید کرے یا آزاد اور اسی طرح اس نے اسے ان رسوم کی ادائیگی کا واحد اجارہ دار قرار دیا جن کے ذریعے کو تائید ایزدی حاصل ہو سکتی ہے۔ گویا کلیسیا نجات کا واحد ذریعہ ہے اور اس دنیا کے مستقبل کی ساری تاریخ کلیسیا کی غیر دینی معاملات میں مکمل فتح و کامرانی کے مترادف ہے۔

رومی سلطنت ایک دنیاوی اور ابلیسی ریاست ہے۔ اس کے مقابلہ پر کلیسیا ایک ملکوتی ریاست ہے جو سب پر غالب ہے' لیکن کلیسیا کا اصل کام زمان و مکان کی حدود سے ماوراء ہے۔ ابدی نجات یا عذاب کے مقابلہ پر یہ ساری زمانی تاریخ ایک غیر اہم واقعہ ہے۔ انسان کی یہ

محدود زندگی ابدیت کا پیش خیمہ ہے۔ کلیسیا کا اساسی کارنامہ یہ ہے کہ تاریخ کے ذریعے وہ ایک ابدی حقیقت کو متمثل کرے' برگزیدہ انسانوں کو اس دنیا کے مصائب سے گزار کر جنت کی پر سرور زندگی کی طرف راہنمائی کرے۔ جنت کی یہ زندگی خدا کا پر جذب مشاہدہ اور خدائی رضا میں گم ہونا ہے۔ وہ لوگ جو مسیح اور کلیسیا کے منکر ہیں' وہ جہنم کی آگ میں ہمیشہ کے لیے ڈالے جائیں گے جہاں وہ مرے بغیر ہر قسم کی تکلیف میں مبتلا کیے جائیں گے۔ نجات کے اس خوفناک مسئلے کے علاوہ دنیاوی زندگی کا ہر مسئلہ اور ہر دلچسپی ایک بے کار مشغلہ ہے۔ شادی بیاہ' بچوں کی پرورش' سماجی زندگی اور اس کے تقاضے سب ہیچ ہیں۔ آگسٹائن کے نزدیک دنیاوی علم بالکل بے کار ہے۔ اس کی افادیت اگر ہے تو صرف اس قدر کہ وہ نجات تک پہنچانے میں کسی قدر معاون ثابت ہو سکتا ہے۔ ایسے علم کا صحیح سرچشمہ حقائق کا مشاہدہ بالکل نہیں' صرف بائبل کے بیانات اور واقعات ہی یہ علم پیدا کرسکتے ہیں۔

آگسٹائن نے مختلف اور متضاد تصورات کو ایک وحدت میں سمو کر ایک ایسا عمدہ علم الکلام تشکیل دیا جس نے آٹھ صدیوں تک مغربی دنیا کے دینیاتی فکر کی راہ اور سمت کو متعین کیا۔ گریگری اعظم کی کتاب "اخلاق" اسی علم الکلام کو ایک عام فہم زبان میں پیش کرتی ہے اور اس کے ذریعہ آگسٹائن کا فکری نظام عوام تک جا پہنچا۔ کیتھولک اور پروٹسٹنٹ دونوں فرقوں میں جو مسائل آج تک زیر بحث آتے رہے ہیں وہ اسی عظیم افریقی مفکر کے مرہون منت ہیں۔

☆